داعی کبیر مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

ملّت کا تحفظ، تحریک نفاذِ شریعت اور غلبۂ اسلام

لائحہ عمل، اور قومی و ملّی منشور

درج ذیل مقالہ داعی کبیر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا حیدرآباد کی دینی تعلیمی اور دعوتی کانفرنس منعقدہ ۱۷ مارچ ۸۷ء کا افتتاحی خطبہ ہے جس سے اہل ہند کی طرح مسلمانان عالم کے لئے بھی غور و فکر کی منزل اور سمت سفر متعین کرنے میں فکر و عمل کے نشان راہ واضح ہو جاتے ہیں یہ مقالہ مفکرین و قائدین ملت قومی کارکنوں اور عام مسلمانوں کے مطالعہ غور و فکر کیلئے ایک ملّی منشور اور میثاق کی حیثیت رکھتا ہے خدا کرے کہ یہاں کے ارباب حل و عقد بھی اس سے پوری طرح مستفید ہو سکیں (ادارہ)

حضرات! میں آپ کی عزت افزائی کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس اہم اجلاس کے افتتاح کے لئے میرا انتخاب فرمایا۔ ایک حقیقت پسند انسان کے لئے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور کسی فریب نفس میں مبتلا نہیں ہے۔ ان مواقع کی قدر و قیمت صرف اتنی ہی ہے کہ ان کے ذریعہ اس کو اپنے دل کی بات کہنے اور اپنے مطالعہ و تجربات کے نتائج کے اظہار کا ایک ایسی فضا میں موقعہ ملتا ہے جس میں اس کی بات صبر و سکون اور اکثر اوقات ذوق و اشتیاق کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ مجھے امید کرنی چاہئے کہ یہ پیش کش آپ کی طرف سے کوئی رسمی اعزاز نہیں ہے۔ بلکہ ایک اعتماد کا اظہار ہے ہر چیز کی ابتدا بڑی نازک اور اہم ہوتی ہے۔ اور اس کا اثر اس کے پورے سلسلہ پر پڑتا ہے خدا مجھے اس اعتماد و ذمہ داری کا اہل ثابت فرمائے۔

بزرگو اور عزیزو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور آپ کے لئے جس ماحول اور جن حالات کا انتخاب فرمایا ہے اور اپنے علم و حکمت اور اپنے ارادہ و اختیار کی بنیاد پر انتخاب فرمایا ہے وہ بہت اہم اور بہت نازک ہے۔ واقعہ

تو یہ ہے کہ یہ ماحول، یہ حالات، یہ سرزمین اور یہ عہد تو کسی بڑے مجدد کا طالب تھا۔ میں تاریخِ اصلاح و تجدید کے نہ صرف طالب علم بلکہ ایک حقیر مصنف کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ جو عہد اور جو ماحول ہم کو آپ کو ملا ہے جن مسائل سے ہمارا آپ کا واسطہ ہے جن خطرات، جن اندیشوں اور جن چیلنجوں کا ہمیں سامنا کرنا ہے اور اس زمانہ کے جن خفی لیکن بے رحم اشاروں کو سمجھنا ہے۔ وہ کسی بڑے مجدد کے کسی صاحبِ عزیمت، صاحب حکمت اور موید من اللہ کے طالب ہیں اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ یہ دور حضرت مجدد الف ثانی کے شایانِ شان تھا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ قابلیت اور مجددانہ عزیمت کے شایانِ شان تھا۔ یا شہیدین جلیلین۔ حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی حمیت و عزیمت اور بلند نظری و بلند حوصلگی کے شایانِ شان تھا۔ لیکن یہ دور، یہ مسائل اور یہ مشکلات ہمارے لئے منتخب کئے گئے۔ ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

لیکن ایک اچھے محنتی طالب علم کو اگر امتحان میں کوئی مشکل پرچہ ملے تو اگر اس نے محنت کی ہے اس میں صلاحیت ہے اور اس نے اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق تیاری کی ہے تو اس کی شان یہ ہے کہ اس پرچہ پر شکوہ نہ کرے بلکہ شکر ادا کرے۔ کہ وہ اس پرچہ کے قابل سمجھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ "واللہ غالب علیٰ امرہ" وہ جو کچھ فیصلہ کرتا ہے وہ اس کی قدرت کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ اس کی حکمت کا بھی۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ اس کی رحمت کا بھی مظہر ہوتا ہے تو بعید نہیں۔ اس کے اس فیصلہ میں (کہ اس نے ہم ناتوانوں کو ایسے عہد اور ایسی سرزمین کے لئے انتخاب کیا) اس کی قدرت کا ظہور بھی ہے اس کی حکمت کا بھی ہے۔ اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس کی رحمت کا بھی ظہور ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آخر زمانہ ایسا ہوگا کہ تم جو کر رہے ہو اس کا عشر عشیر بھی اگر کوئی انجام دے گا تو اس کی نجات ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ اگر ہم اس عہدِ سعادت میں ہوتے اور اس زمانہ میں کوئی عمل کرتے تو اس عمل کی اس زمانہ میں کوئی بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت نہ ہوتی۔ قیمتیں اپنے حالات اور اپنے ماحول کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی ہیں۔ بے موسم کا پھل بڑی قیمت میں بکتا ہے لیکن موسم کا پھل کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی بڑے حملہ کے موقعہ پر دفاع کرنے والوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں اور جب سارے شکست آثار ہوں اس وقت کوئی کمزور سپاہی، کوئی سن رسیدہ، کوئی بیمار مسلمان قدم جمائے کھڑا رہے تو اس کو جو اجر ملے گا غلبہ و فتح کے وقت بڑے شہسوار اور شہ زور کو نہیں ملے گا تو کیا عجب کہ اللہ نے ہماری کمزوری، ہماری بے بضاعتی کے باوجود ہم کو جو ایسے پُر آشوب دور کے لئے منتخب فرمایا یہ اس کی رحمت کا کرشمہ ہو اس نے ہمیں ایک ایسا زمانہ دیا ہے کہ اس کے اندر تھوڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت شمار ہوگا۔

حضرات! جہاں تک کسی ملک میں مسلمانوں کے رہنے، وہاں ان کی حیثیت اور ان کے فرائض منصبی کا سوال ہے تو تاریخ اسلام کے طویل سلسلہ اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں اس کے دو نمونے ملتے ہیں۔ پہلا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حاکمانہ حیثیت میں ہوں اور وہ ملک اسلامی حکومت کے زیر اقتدار ہو جیسا کہ خلافت راشدہ کے بعد رومی و ایرانی شہنشاہیاں اور ان کے ممالک مسلمانوں کے زیر نگیں آئے۔ اور مسلمان جزیرۃ العرب سے لے کر مراکش تک پھیل گئے۔ انہوں نے افریقہ کی پوری شمال مغربی پٹی فتح کر لی۔ اور اس سے آگے سمندر کو عبور کر کے یورپ کے اسپین پر قابض ہو گئے۔ اس حیثیت کے متعلق صریح احکام ہیں۔ قرآن مجید کے اشارات ہیں۔ ہدایات ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا طرز عمل ہے اور عقیل سلیم کا فیصلہ ہے۔ کہ ایسے موقعہ پر مسلمانوں کا منصب کیا ہے۔ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ ان کے داعیوں و مصلحین کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ ان کے علماء فقہا اور مقننین کو مسائل کس ڈھنگ سے سلجھانے چاہئیں؛ اور ان کے مصنفین و مؤلفین و مفکرین کا طرز فکر اور اسلوب کیا ہونا چاہیئے۔ یہ بات واضح ہے اور اس کے لئے پورا تاریخی ریکارڈ موجود ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مسلمان کسی جگہ مختصر و محدود اقلیت میں ہوں۔ وہ اس ملک کے حالات پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکتے ہوں۔ ان کا ملک کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہ ہو وہ خالص محکومانہ زندگی گزار رہے ہوں اس کے لئے بھی کتابوں میں فقہ و شریعت کے احکام موجود ہیں۔

لیکن ہندوستان میں ہماری نوعیت اس وقت دونوں سے مختلف ہے اور وہ بڑی فکر انگیز، اجتہاد طلب، اعلیٰ ذہانت، حقیقت پسندی اور سخت جد و جہد کی طالب ہے اور اس سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہاں ہم اقلیت میں تو ضرور ہیں لیکن وہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اکثریت کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔ اور اس کو اقلیت کہنا بھی صحیح نہیں۔ بلکہ اس کو "ملت" کہنا چاہیئے۔ ہم یہاں کم سے کم پندرہ کروڑ کی تعداد میں ہیں۔ بہت سی خالص اسلامی سلطنتوں میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہیں۔ کوئی اسلامی ملک ۳۰ لاکھ کا ہے کوئی ۴۰، ۵۰ لاکھ کا ہے۔ کوئی دو کروڑ ہے۔ کوئی ۴، ۵ کروڑ تک کا ہے۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے وہ بھی تیرہ ساڑھے تیرہ کروڑ سے زیادہ نہیں ہے لیکن ہم یہاں پندرہ کروڑ یا اس سے بھی زائد ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملک جمہوری ہے اس ملک کی سیاست میں ہمارا حصہ ہے اس ملک کی قانون سازی میں ہمارا حصہ ہے۔ ہمارے لئے یہاں پورا موقعہ ہے۔ کہ ہم ملک کے انتظامیہ کو نہ صرف یہ کہ متاثر کریں بلکہ اس کو نئی شکل دینے اور ملک کو بہتر سے بہتر انتظامیہ مہیا کرنے میں ممد و معاون بلکہ بعض اوقات فیصلہ کن ثابت ہوں۔ ہم پاسنگ کا بھی کام کر سکتے ہیں اور اس ملک میں قانون سازی ہم کو نظر انداز کر کے نہیں ہو سکتی۔ اگر مسلمان اپنے شہری حقوق کا صحیح جرأت مندانہ و آزادانہ استعمال کریں تو ایوان قانون ساز (پارلیمنٹ) اور حکومت کرنے والی پارٹی کسی طرح

مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ وہ مسلمانوں سے مستغنی نہیں رہ سکتی۔ اور مسلمان چاہیں تو اس پر انقلاب انگیز اثر ڈال سکتے ہیں اور اس کی ہیئت کذائی بدل سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اس ملک میں ہم تنہا وہ "ملت" ہیں جو خدا کا واضح پیغام رکھتی ہے جو آخری آسمانی محفوظ کتاب کی حامل ہے۔ سیرت نبوی کی دولت اس کے پاس ہے۔ نوعِ انسانی کے لئے رحمت و ہدایت کا عظیم سرمایہ، اسوۂ نبوی، حیاتِ صحابہؓ اور مثالی و معیاری انسانوں کے کردار و عمل کا عظیم ذخیرہ (ریکارڈ) موجود و محفوظ ہے۔ وہ اس سیرت و طرزِ زندگی کا عملی مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کی ہدایت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ یہ وہ ملت ہے جس کے پاس ہر عہد میں کسی ڈوبتے ہوئے معاشرہ۔ کسی بجھتے ہوئے چراغ کو کسی برباد ہوئے ملک کو۔ کسی رو بہ زوال نہیں بلکہ جاں بہ لب ملک یا معاشرہ کو بچا لینے والا پیغام رہا ہے اس نے پہلی اور دوسری صدی ہجری (ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی) میں رومی، ایرانی اور وسطِ ایشیا کے برسرِ اقتدار ترکستانی معاشرہ کو (جو زیادہ دنوں تک باقی رہنے اور قیادت کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ اور جس کی ظاہری چمک دمک اور فربہی صحت و توانائی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک غیر طبعی فربہی متورم جسم کی علامت تھی۔) اور ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں نیم وحشی اور خون آشام چینی و ترکی نسل کی تاتاری قوم ایک بنیاد دین و عقیدہ، مقصدِ زندگی، روحانیت، ترقی یافتہ تہذیب و ثقافت، جامع و مکمل معاشرتی، تمدنی و انتظامی قانون اور نو بہ نو علوم و آداب دے کر ایک نئی زندگی کی ایک نئی قسط عطا کر دی۔ اور انہی کی ایک شاخ عثمانی ترکوں کو جنہوں نے ساتویں صدی ہجری میں اسلام قبول کیا۔ اور اسلام لاتے ہی ان میں بیداری، نئی زندگی اور حوصلہ مندی پیدا ہوئی۔ ایشیائے کوچک اور یورپ میں ایک بڑی سلطنت (سلطنت عثمانیہ) کا بانی بنا دیا۔ جس نے کچھ عرصہ کے بعد خلافت اسلامی کی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔ اور حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ کی محافظ و پاسبان اور شوکت و عظمت اسلامی کا نشان بن گئی۔

یہ وہ ملت ہے جو ڈوبتے ہوئے سفینہ کو ساحل تک پہنچا سکتی ہے۔ اور کسی گرتے ہوئے معاشرہ کو جو زمین میں بالکل دھنس رہا اور دلدل میں پھنس رہا ہے اور جو خودکشی و خودسوزی پر آمادہ ہے بچا سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس وہ کتابِ الٰہی ہے اس کے پاس وہ اسوۂ نبویؐ ہے۔ اس کے پاس وہ ایمان موجود ہے جو اس کو خالص دولت پرست، طاقت پرست، اقتدار پرست اور مادہ پرست بننے سے روکتا ہے یہ تنہا وہ ملت ہے جس کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا یقین ہے اس پر غفلت کے چاہے کیسے اور کتنے ہی دبیز پردے پڑیں۔ اس پر خود فراموشی کے کتنے شدید دورے پڑیں۔ اس کے دلوں کے اندر اس بات کا شعور باقی ہے کہ اس کو خدا کے سامنے جانا ہے۔ اللہ کے رسولؐ کو منہ دکھانا ہے اور اپنی زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے وہاں نہ عز

کام آئے گی۔ نہ دولت نہ طاقت کام آئے گا۔ احساس فرض، سچی عبودیت اور بے لوث خدمت خلق کام آئے گی اور ایمان اور عمل صالح کام آئے گا۔

میرے محدود مطالعہ میں اس ملت کی حیات اور اس کے طویل سفر اور تجربوں میں یہ بالکل انوکھی مثال ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں۔ ہم عظیم ترین اقلیت میں ہیں۔ یہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر وہ اپنی امتیازی صلاحیت کا ثبوت دے۔ اکثریت سے زیادہ محنت سے کام کرے اور اپنی اہلیت و افادیت، اپنے خلوص و صداقت کا مظاہرہ کرے تو وہ قیادت کا مقام بھی حاصل کر سکتی ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو کم از کم ملک کا رخ تبدیل کر سکتی ہے اور صاحب اقتدار جماعت کو اپنی ضرورت و افادیت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ اس میں حقیقی زندگی کی وہ رمق باقی ہے (میں اس کو زندگی کی رمق ہی کہوں گا) جو دنیا کی اکثر ملتیں کھو چکی ہیں روحانی حیثیت سے، ایمانی حیثیت سے، اور احتساب نفس کے لحاظ سے وہ ملتیں، اس آخری اخلاقی شعور اور ضمیر کی زندگی و بیداری سے محروم ہو چکی ہیں۔ جس کو زندگی کی رمق کہا جانا چاہئے۔ یہ ملت اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ اس رمق کی محافظ ہے۔

ایسی حالت میں اس ملت کے علماء کی علوم دینیہ کے اہل نظر و اہل فکر ماہرین کی ملت کے بے لوث و بالغ نظر قائدین کی، اس ملک اس عہد اور اس ماحول میں ذمہ داری اتنی عظیم اور عظیم ہونے کے ساتھ اتنی نازک اور اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کا تصور اس سے پہلے کسی ملک میں کرنا مشکل تھا۔ پندرہ کروڑ کی تعداد میں مسلمان ایک ایسے ملک میں موجود ہیں۔ جو لرزہ خیز مصائب اور ہوشربا مسائل سے دوچار ہے۔ جہاں عرصہ سے انسان سازی کا۔ اخلاق و کردار کے بنانے اور ان کو توانائی بخشنے کا، دولت کی کشش اور مادیت کے سحر کا مقابلہ کرنے والی اخلاقی و روحانی طاقت پیدا کرنے کا کارخانہ بند ہو چکا ہے۔ اس کے جو بھی اسباب ہوں (ان اسباب کی اس مختصر مقالہ میں تشریح نہیں ہو سکتی) یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا معاشرہ ایک اخلاقی بحران میں مبتلا ہے۔ جس کے آثار و نشانات قومی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہیں۔

ایسی حالت ایک ملت یہاں رہتی ہے جو ۸ کروڑ کی تعداد میں بتائی جاتی ہے۔ وہ اپنے پاس اللہ کی کتاب صحیفۂ آسمانی رکھتی ہے۔ سنت نبوی مدون اور محفوظ طریقہ پر اس کے پاس ہے۔ فقہ اسلامی کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو زندگی کے تمام احکام (عبادات سے لے کر معاملات و سیاست مدن و اخلاق و اجتماع کے آداب تک) پر مشتمل ہے۔ جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی جاتی۔ فقہ کا جتنا بڑا کام اعمال اور انسانی زندگی کے تنوعات کا ثواب و عذاب کے عقیدہ اور ایمان سے اور انسانی حرکات و اعمال کا۔ حلال و حرام، جائز و ناجائز کے تصور سے جو ربط ہے اس ربط کی تفسیر و تشریح کرنے کے سلسلہ میں جو محنت اسلام کی تاریخ میں ہوئی ہے اس کی کوئی مثال مجھے معلوم نہیں اور اس

کی کوئی نظیر گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرات! ہم ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں اگرچہ ہم اصطلاحی طور پر اقلیت میں ہیں لیکن حقیقت میں پوری قوم ہیں پوری ملت ہیں۔ اس کے ساتھ ایک تاریخ ہے۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس تک اس نے حکومت کی ہے۔ اس ملک کو بنایا ہے، سنوارا ہے۔ ملک کا نام دنیا میں روشن کیا ہے۔ اس نے ملک کو وہ چیز دی جس سے وہ عرصہ سے محروم ہو چکا تھا۔ اس میں پہلی مرتبہ سیاسی و انتظامی وحدت پیدا کی۔ اس کو مساوات و اخوتِ انسانی کا پیغام دیا اور ہندوستان کو جو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا ایک طویل و وسیع، مضبوط و مستحکم توانا و صحت مند انتظامیہ اور وسیع مرکزی حکومت عطا کی۔

اس کے بعد سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم آخری امت ہیں۔ ہم حاملِ قرآن ہیں ہم داعی الی اللہ ہیں۔ ہم محتسب کائنات ہیں۔ اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ حقیقت ادا کرائی ہے۔ اس کے سامنے اس کی مجلس شوریٰ میں مختلف قوموں کے بارہ میں کہا گیا اور مختلف خطروں کی نشان دہی کی گئی۔ اس کی مجلس کے ارکان نے کہا ہمارے نظام اور کام کو اشتراکیت سے خطرہ ہے۔ جمہوریت سے خطرہ ہے۔ ملوکیت سے خطرہ ہے۔ جمہوریت سے خطرہ ہے کسی نے کہا ہے کہ ؎

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئے بار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیاست پر مدار

ابلیس نے ان تمام خطروں کو کوئی اہمیت نہیں دی اس کے برخلاف اس نے کہا ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس نے کہا ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کے خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

مسلمان قوم کا یہ امتیاز اور اس ملک کا جمہوری نظام، پھر مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی، یہ ساری باتیں مواقع فراہم کرتی ہیں کہ ہم یہاں کے نظم و نسق پر اثر انداز ہوں۔ یہاں قانون بنانے میں ہمارا حصہ ہو سکتا ہے پھر اس ملک کے جمہوری ہونے کی وجہ سے اس ملک کی قیادت کا منصب بھی ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کو اتفاقی طور پر، باطنی طور پر، ذہنی طور پر اور عملی طور پر بھی ممتاز و فائق ثابت کر دیں تو اس ملک کی قیادت کے ہم طالب نہیں ہوں گے ملک کی قیادت خود ہماری طالب ہوگی۔ ہمیں سورج کا چراغ لے کر ڈھونڈے گی۔ یہاں کی خاک کے ذرہ ذرہ، درخت کے پتہ پتہ سے آواز آئے گی کہ اس ملک کو بچانے والے کہاں ہیں۔ آئیں اور اس ملک کو بچائیں۔ آپ کی یہ حیثیت نہیں ہے،

کہ آپ کو کچھ آسمانیاں چاہئیں۔ کچھ آسامیاں چاہئیں۔ آپ ملک کے نجات دہندہ ہیں۔ آپ اس ملک کی آخری امید ہیں۔ اس ملک کے باشندوں کو ہم عدل کا پیغام دیں۔ عقل سلیم کا پیغام دیں۔ خدا ترسی اور انسان دوستی کا پیغام دیں اور اس میں اس کا لحاظ رکھیں کہ ہمارا وہ پیغام ہمارے اسلامی عقیدہ اور ایمانی جذبہ کے ساتھ مربوط اور جڑا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ ذہین لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص طرح کی قوت شامہ عطا فرمائی ہے۔ (جو معنویات میں بھی اسی طرح کام کرتی ہے جیسے مادیت (جسمانیات میں) اس عمومی انسانی دعوت میں ہمارے ایمان کی خوشبو اور مہک پائیں۔ وہ یہ محسوس کریں کہ یہ خود غرضی کا پیغام نہیں۔ نفسیات کا پیغام نہیں۔ اس کے پیچھے سیاسی یا اقتصادی مقاصد نہیں۔ یہ وہ پیغام ہے جس کو ان لوگوں کے ایمان باللہ و تعلیمات اسلامی نے پیدا کیا۔ اور جلا اور طاقت دی ہے اور اس پیغام کا سرچشمہ اور اس کا محرک و داعی ان کا خدا ہے (جو رب العالمین ہے) اور خدا کے اس آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے رابطہ ہے۔

اگر ہم یہ کام کر لیں گے تو صرف یہی نہیں کہ ہم اس ملک میں عزت سے رہ سکیں گے بلکہ اس ملک کی قیادت ہم کو تلاش کرے گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام جیل گئے اور ایک ایسے الزام میں گئے جس کے بعد ایسے "اسیر زندان" کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا اور وہ آدمی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن انہوں نے اپنے کردار سے، اپنی عملی صلاحیت سے۔ اپنی معجزانہ ایمانی طاقت سے۔ اپنی انسان دوستی سے جیل کے اندر رہ کر بھی یہ ثابت کر دیا کہ وہ مصر میں تنہا آدمی ہیں جن کے پاس ایمان ہے جن کے پاس کردار کا جوہر ہے۔ جن کے پاس عملی صلاحیت ہے ان دوستی کا جذبہ اور امانت و دیانت ہے۔

بالآخر بادشاہ مصر ان کو جیل سے بلواتا ہے لیکن وہ خودداری کے ساتھ کہتے ہیں:۔

اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝

اپنے آقا کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے بیشک میرا پروردگار ان کے مکر سے خوب واقف ہے۔

بادشاہ نے پھر تحقیق کی اور مدعیہ نے کہہ دیا

مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ

حاشا للہ۔ ہمیں اس میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔

اس کی کوئی خطا نہ تھی۔ یہ سب میرا پھیلایا ہوا جال اور میری بنائی ہوئی سازش تھی۔

جب وہ جیل سے نکلے تو بادشاہ نے پیش کش کی کہ آپ کوئی عہدہ قبول کیجئے انہوں نے کہا۔ اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۝

مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف ہوں۔

قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں جو حالات کی تفصیل بیان کرے۔ لیکن اس قصہ کے سیاق میں ہمیں یہ بات مفہم معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جنہوں نے سالہا سال مصر میں گذارے تھے سمجھ گئے کہ اس ملک اور انتظامیہ کا سب سے زیادہ کمزور شعبہ مالیات اور غذا کا شعبہ ہے۔ اور یہ وہ شعبہ ہے جو عوام سے زیادہ سے زیادہ ربط رکھتا ہے جس کے ذریعہ ہر جگہ عوام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اور ان کی بے لوث خدمت کر کے ان کو ممنون و متاثر اور ان کو صحیح عقائد اور واضح حقائق پر غور کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۝

حضرات! ساری سیاسی پارٹیوں کی موجودگی میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی موجودگی میں اور تعلیم کا معیار جو اس وقت ہے اور اس کے جو وسائل اس ملک کو مہیا ہیں۔ ان سب کے باوجود صالح قیادت، عادل قیادت، خدا ترس قیادت اور انسان دوست قیادت کا منصب خالی ہے۔ آپ اپنی حیثیت پہچانیں، اپنا منصب جانیں اور ملک میں خدمت، ملک میں صالح انقلاب لانے اور ملک کو صحیح رخ پر لگانے اور چلانے کی اپنی صلاحیت کو پہچانیں اور اس سے کام لیں۔

ہم کو ملک و ملت دونوں زندہ حقیقتوں میں سے کسی حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کرنی چاہئیں۔ البتہ ہماری داعیانہ حیثیت، ہماری بے لوث اور خدا اندیش فطرت اور ہمارا وہ فرض منصبی جس کی بنا پر ہم کو "خیر اُمت" کا لقب ملا۔ اس پر غالب رہنا چاہئے۔ اس سود و زیاں کی دنیا میں اس قمار خانہ سیاست میں ہماری اصول پسندی ہمارا اخلاقی کردار اور ہمارا ایمانی شعار سب پر غالب رہنا چاہئے۔ ہمیں ان سیاسی پارٹیوں کی پست سطح پر کبھی نہیں آنا چاہئے جو دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر اور دوسروں کی بربادی میں اپنی ترقی کا خواب دیکھتی ہیں۔ اور جن کا منتہائے نظر حکومت کی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں اس ملک کے بارہ میں بھی اور اس ملت کے بارہ میں بھی اپنا ذہن نبوی و آسمانی تعلیمات کی اساس پر تعمیر کرنا چاہئے۔

حضرات! اس کے ساتھ ساتھ ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمانوں میں دینی شعور پیدا کریں۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں میں دینی شعور پیدا کریں۔ ہماری آئندہ نسلیں ارتداد کے خطرہ میں مبتلا ہیں۔ تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو بالکل کھلی سی بات ہے۔ لیکن اعتقادی ارتداد کا خطرہ بھی سر پر آ گیا ہے۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ قصبات میں، گاؤں میں، شہروں میں محلوں میں، گھروں اور برادریوں میں، بچوں کو دینی تعلیم دینے کا احساس پیدا کریں۔ مدارس اور مساجد قائم کریں اور ان کا جال بچھا دیں۔ میں اس موقعہ پر اپنی ایک گذشتہ تقریر کا اقتباس پیش کروں گا جو میں نے کچھ عرصہ پہلے دینی کونسل کے پلیٹ فارم پر کی تھی:۔

"اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملّت کے لئے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو میں کہوں گا" ما تعبدون من بعدی "لکھ دو۔ پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کے لئے اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ " ما تعبدون من بعدی" (میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے) میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیمانہ پر، خاندان کے پیمانہ پر، برادری کے پیمانہ پر۔ اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ ملّت کے پیمانہ پر اور ملت ہندیہ اسلامیہ کے پیمانہ پر، ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستہ پر چلے گی۔ وہ کس گروہ و ملت کی پیرو ہوگی۔ کس کی پرستش کرے گی کن عقائد کو مانے گی۔ یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں خداؤں اور دیوتاؤں کی۔ یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دستِ قدرت کا کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی"

اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اپنے ملّی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدوجہد شروع ہوگئی ہے اس کو جاری رکھیں ہم کو کسی ملک میں دریا کی مچھلیوں کی طرح (جن کی کوئی شناخت نہیں ہوتی) زندگی گذارنے کی اجازت نہیں۔ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ نے پوری ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جو پہلے سے قائم تھا اس کو اپنا موضوع بنایا۔ پھر یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ہے ان سب مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں بھی میں اپنی گذشتہ تقریر کا کچھ حصہ پیش کروں گا جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس بمبئی منعقدہ ۱۵/۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء میں کی گئی، میں نے کہا تھا:-

"مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کریں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے۔ اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔ فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی۔ اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوقِ عبادت کے باوجود

اور گھر میں مسلمان نہیں۔ اپنے معاملات میں مسلمان نہیں۔ اپنے عائلی و خاندانی روابط تعلقات میں مسلمان نہیں۔ اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے۔ ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے۔ جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے۔ اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کو اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہارِ خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے۔"

حضرات میں نے چند سال ہوئے اندور میں ٹیگور ہال میں پیامِ انسانیت پر تقریر کی۔ اس موقعہ پر R.S.S. کے لوگ موجود تھے، اگلے دن ایک وفد میری قیام پر آیا مجھے معلوم ہوا کہ اس میں R.S.S. کے لیڈر اور اس کے ذمہ دار ہیں اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ "کل آپ کی تقریر سن کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے۔" میں اس تاثر اور شہادت کو اپنے اور پوری ملت کے لئے قابلِ شکر سند سمجھتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ آپ کی ہر بات سے اس کا اظہار ہوا اور یہاں کے شہری یہ سمجھیں کہ آپ کو اس ملک کی ان سے زیادہ فکر ہے۔ آپ کو دولت سے زیادہ ملک عزیز ہے۔ آپ کو یہ معاشرہ عزیز ہے۔ لوگوں کا عزت کے ساتھ، سکون کے ساتھ، امن و امان کے ساتھ رہنا آپ کو دولت کمانے سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں میں بھی یہ بات نہیں رہی وہ بے تکلف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے اس سطح پر آجاتے ہیں اور وہ کام کر لیتے ہیں جس سے ملک خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ معاشرہ بری طرح زوال کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور پوری پوری کمیونٹی بلکہ ملک کی اس عظیم آبادی میں اس صورتِ حال سے حقیقی طور پر مضطرب و بے چین ہونے والا اور اپنی کمیونٹی، پارٹی، فرقہ اور جماعت کی ملامت و تنقید یا مدح و تعریف سے بے پرواہ و بے نیاز ہو کر تنقید و احتساب کا فرض ادا کرنے والا اور خطرہ کا بگل بجانے والا دور دور نظر نہیں آتا۔

حضرات! آپ کے اس اجلاس میں بڑے بڑے علماء، فضلائے علوم دینیہ، زعماء و قائدین، اہلِ قلم و مفکرین موجود ہیں۔ میں اپنی اس گذارش کو اسلام کے عہدِ اول کے ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ کو یاد دلانے پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے لئے پورا پیام رکھتا ہے۔

جس وقت جزیرۃ العرب میں ارتداد کی آگ پھیل گئی تو یہ سب کی ذمہ داری تھی۔ لیکن ذمہ داری کے

احساس میں فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق آدمی کو بڑا اور زندہ جاوید بناتا ہے۔ ابوبکرؓ اس وقت خلیفۂ وقت تھے انہوں نے کہا اَیُنْقَصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہوسکتی ہے؟ کوئی قطع برید ہو سکتی ہے؟ حیف ہے میری زندگی پر اگر میرے سامنے شریعت اسلامی میں ترمیم ہونے لگے اور اس کے فرائض و احکام میں انتخاب کیا جانے لگا کہ نماز تو ٹھیک، حج بھی ٹھیک، روزہ بھی ٹھیک، لیکن زکوٰۃ نہیں۔ یا زکوٰۃ بھی ٹھیک، روزہ نہیں۔ میں زندہ ہوں اور میرے سامنے یہ تحریف ہو؟ ہو نہیں سکتا۔

بس یہ حمیت تھی جو ابل کر ان کی زبان پر آئی اور یہ لفظ ان کی زبان سے نکلے۔ اور اس نے زمانہ کی کلائی موڑ دی اور تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ ایک انسان کی حمیتِ اسلامی، ایک انسان کے احساسِ ذمہ داری نے تہ بہ تہ مشکلات کو کائی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ تاریخ لمبی ہے اور واقعۂ ارتداد اور اس کی تفصیلات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ لیکن حقیقت میں جو فیصلہ کن بات تھی۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات تھی:۔

"یہ نہیں ہوسکتا میں زندہ ہوں اور دین پر حرف آئے"۔ میں نے جو دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پایا تھا وہ دین بے کم و کاست سو فیصدی رہے گا۔ ایک نقطہ کو بھی میں اپنی جگہ سے مٹنے نہیں دوں گا۔ اور انہوں نے کر کے دکھا دیا۔ اور آج اسلام اپنی پوری شریعت، اپنے ارکان و فرائض اور اپنے مکمل ڈھانچہ کے ساتھ موجود ہے۔

عہد حاضر بھی اس وقت کے علماء و قائدین اور سچے وفادار حاملین دین سے اسی دینی غیرت و حمیت اور اسی ہمت و عزیمت کا متوقع و منتظر ہے اور مستقبل کا مورخ ہی نہیں عہد حاضر کا حقیقت نگار اور وقائع نویس بھی گوش برآواز ہے کہ وہ ہماری زبان (صرف زبانِ قال نہیں زبانِ حال) سے یہ اعلان سنے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

نوٹس

عام اطلاع کے لئے مشتہر کیا جاتا ہے کہ پاک۔ چیک بارٹر پروٹوکول نمبر ۲۲ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۸۷ء کی ایل/سی کھولنے کیلئے مورخہ ۱۹۸۸-۶-۳۰ تک اور شپمنٹ کیلئے مورخہ ۱۹۸۸-۹-۳۰ تک کی توسیع کی گئی ہے۔

بشیر احمد بھٹی، سیکشن آفیسر

PID(1) 1491/56